ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمان

اسلامی دستور کا تصوّر

ڈاکٹر ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب پاکستان کی عدالتِ عالیہ کے جج ہیں اور علمی دنیا میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ مقالہ بین الاسلامی مجلسِ مذاکرہ میں پڑھا تھا۔

ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی صورت میں پاکستان کا قیام دستورِ اسلامی کے تصوّر کے لئے بڑا زبردست محرّک ثابت ہوا۔ تاہم اس موضوع پر اکثر غیر منطقی انداز میں غور و فکر ہوتا رہا ہے۔ مثلاً بیشتر اصحاب جب دستورِ اسلامی کے بارے میں گفتگو کرتے تھے تو ان کے ذہن میں محض یہ مبہم سا خیال ہوتا تھا کہ اس کا مطلب ملک میں قوانینِ اسلامی کا نفاذ ہے۔ باقی حضرات دو جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک جماعت کا دعوےٰ تھا کہ قرآن میں، جو قانون اسلامی کا مبدأ و منبع ہے، ایک جدید دستور کے تمام امکانی عناصر تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری جماعت کا خیال تھا کہ دستورِ اسلامی کا تصوّر ایک سراب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اور اس قسم کی کوئی چیز احکامِ قرآنی سے اخذ نہیں کی جا سکتی۔ ان دونوں نظریات میں صداقت صرف جزوی طور پر پائی جاتی ہے۔

قرآن قانونی قواعد کی کتاب نہیں۔ یہ کتاب دوسری باتوں کی بہ نسبت حیاتِ انسانی کے روحانی اور اخلاقی پہلو پر زور دیتی ہے۔ صحیح معنوں میں جو قانونی دفعات قرآن میں موجود ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور وہ ان موضوعات کی ایک مختصر نوع تک محدود ہیں۔ جدید علم سیاسیات میں دستور و آئین کا جو مفہوم لیا جاتا ہے اس کا کوئی باقاعدہ سانچا قرآن میں موجود نہیں۔

آخر دستور کا مطلب کیا ہے؟

بالعموم اس سے مراد ایک ایسی دستاویز لی جاتی ہے جو ایک مخصوص آئینی تقدس کی حامل ہو جس میں کسی حکومت کا پورا ڈھانچہ اور اس کے مختلف اعضاء کے فرائض بیان کئے گئے ہوں اور اس کے ساتھ ہی ان بنیادی اصولوں کا ذکر بھی ہو جن کے ماتحت یہ اعضاء اپنے فرائض سرانجام دیں۔ قرآن کے ایک سرسری مطالعے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی مملکت کی دستوری ہیئت کے متعلق گھڑے گھڑائے قاعدے اس میں نہیں مل سکتے۔ البتہ بعض ایسے بنیادی اصول ضرور نظر آ جاتے ہیں جن کا اطلاق اسلامی تصوّر کو ایک واضح طرزِ زندگی میں سمونے کے لئے ہماری اجتماعی روش

حیات پر ہو سکے اور یوں اسلامی نظامِ سیاست کی ایک ضروری بنیاد فراہم ہو جاتی ہے۔

میرے نزدیک یہ نظریہ قرآن کے اس ارشاد خداوندی سے متصادم نہیں ہوتا کہ "ہم نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا" اکملت لکم دینکم (۵: ۳) بلکہ یہ اس سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کے الفاظ میں "حیات کی انتہائی روحانی اساس ابدی ہے اور یہ تنوع اور تغیر" کی صورت میں اپنے آپ کو منکشف کرتی ہے حقیقت کے کسی ایک ایسے تصور پر مبنی معاشرہ اپنی زندگی میں لازمی طور پر ثبات اور تغیر کے درمیان مفاہمت کی راہیں نکال لیتا ہے اس میں لازماً ایسے ابدی اصول موجود ہونگے جن کے مطابق حیاتِ اجتماعی کو منضبط کیا جا سکے۔ کیونکہ "ابدی" اصول ہمیں اس ہر دم متغیر دنیا میں ایک مضبوط سہارا مہیا کرتے ہیں لیکن اگر ان دائمی اصولوں سے یہ مراد لی جائے کہ یہ اس تغیر کے سارے امکانات کو خارج کر دیتے ہیں جو از روئے قرآن اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین "نشانیوں" میں سے ہے تو یہ فطرت کو، جو اساسی طور پر حرکی ہے، جامد بنا دینے کا ذریعہ ہو جائیں گے۔

اسلام میں زندگی پر ایک جامع نظر ڈالی گئی ہے۔ زندگی کو مذہب اور مملکت کے دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کرنا روح اور جسم کی اس ثنویت کے مماثل ہے جو مغربی فکر میں نظر آتی ہے۔ یہ تفریق فی الحقیقت روحِ اسلام کے منافی ہے۔ ایک روحانی اندازِ فکر اختیار کرنے سے وہ چیز بھی تقدس کی حامل ہو جاتی ہے جسے بالعموم دنیاوی کہا جاتا ہے۔ ایسے نظامِ فکر میں جہاں ہر قسم کے نظریات مجتمع ہوں، اگر ان تغیرات کو قبول کرنے کی گنجائش نہ ہو جو ارتقائے حیات کے عمل کے لئے ضروری ہیں تو اس سے کاملیت کی توقع عبث ہو گی۔ اسی لئے خدائے دانا و بینا نے شریعتِ الٰہیہ کو غیر متغیر اساسی اصولوں میں محدود کر دیا ہے اور مختلف حالات میں ان کے اطلاق اور ہر دور میں اپنے تجربے، علم اور ضروریات کے مطابق ضمنی قوانین کی تفصیل طے کرنے کے مسائل چھوڑ دیئے۔ یہی اصلِ اجتہاد ہے جو ہمیں مختلف ادوار میں قانونی مسائل کے بارے میں اپنی آزادانہ رائے قائم کرنے کے قابل بناتا ہے اور اسی کو اقبال نے اسلام میں اصولِ حرکت کا نام دیا ہے۔ اسلامی فکر میں یہ حرکی اندازِ نظر جیسا کہ بعض مغربی اہلِ قلم کا خیال ہے، ہمارے نام نہاد جدت پسند مسلمانوں کا کوئی نو ایجاد نظریہ ہرگز نہیں بلکہ اسلامی معاشرے کی علمی میراث کا ایک حصّہ ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ اس کی اصل اہمیت اور مفہوم کو سیاسی اور معاشرتی انحطاط کے زمانے میں تاریخی عوامل نے نظروں سے اوجھل کر دیا تھا لہٰذا میرے نزدیک اسلام میں مملکت کی ہیئت سے مراد وہ انسانی ادارہ ہے جسے اگر اسلامی رہنا منظور ہے تو اسے کسی طور بھی اسلامی نظامِ سیاست کے اساسی اور لازمی اصولوں کے خلاف راستہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ اس پابندی کو قبول کرنے کے بعد وہ اپنی آئینی تفاصیل کی مختلف النوع صورتیں ختم کر سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر ہمارے لئے ان بنیادی اصولوں پر نظر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے جو اس ادارے میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآن میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ "امر" و "حکم" صرف ذاتِ باری تعالیٰ سے مخصوص ہیں۔ اس اصول کی رُو سے ایک اسلامی مملکت میں کسی انسان کی آمریت۔ خود مختار ملوکیت یا مطلق العنانیت کے امکان کی نفی ہو جاتی ہے مسلم رعایا کی اطاعت کا مرجع کوئی انسانی قانون نہیں بلکہ شریعتِ آلہیہ ہے اور حاکم مملکت کو بھی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ ایک اسلامی مملکت کو ہم صرف اسی مفہوم میں دینی حکومت کہہ سکتے ہیں اور اس مفہوم میں ہرگز نہیں کہ اس پر ملاؤں کی ایک ایسی جماعت حکومت کرتی ہے جو احکامِ الٰہی کی تاویلات میں اپنے آپ کو ہر خطا سے ہر غلطی سے ماورا سمجھتی ہے۔ دراصل اسلام نے ان معنوں میں ملّائیت کی گنجائش ہی نہیں رکھی۔ وہاں تو اعمال کی انفرادی ذمّےداری پر زور دیا گیا ہے اور خالق و مخلوق کے مابین کسی درمیانی واسطے کا وجود تسلیم نہیں کیا گیا۔

۲۔ قرآن پاک میں عقیدۂ توحید جس طرح بیان کیا گیا ہے اس سے مساواتِ انسانی کا پہلو واضح طور سے نکلتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے لکھا ہے

"ایک عملی تصوّر کی حیثیت سے توحید کی اصل ہے مساوات۔ اتحادِ عمل اور حریّت"

نسل، قبیلے، رنگ، زبان، پیشے اور ملک کا لحاظ اس اصول کو متاثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ

"خدا کی نظر میں وہی شخص سب سے زیادہ عزت والا ہے جس کے دل میں خدا کا خوف سب سے زیادہ ہے"

مسلمانوں کے درمیان مشترک رشتہ یہی ہے کہ وہ ایک ہی تصوّرِ حیات پر ایمان رکھتے ہیں سورۃ النور میں ہمیں ایک بشارت ملتی ہے کہ وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں انہیں روئے ارض پر خدائے تعالیٰ کا خلیفہ بنایا جائے گا۔ یہاں یہ بات بالخصوص اہم ہے کہ یہ بشارت مجموعی طور پر تمام مومنوں کو دی گئی ہے ان کے حاکمِ وقت کو نہیں لہٰذا اس اصول کے تحت قوت کا سرچشمہ جماعت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جماعت اگر مناسب سمجھے تو اپنے حقوق و فرائض کسی ایک فرد یا نمائندہ ادارے کو تفویض کر دے۔ اس تفویض کی بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر کہیں بھی ممانعت نہیں کی گئی اس لئے یہ ہر اعتبار سے جائز ہوگی۔ اس کی تائید اس ارشاد قرآنی سے بھی ہوتی ہے جس میں منجملہ اور چیزوں کے اولی الامر منکم (وہ حاکم جو خود تم میں سے ہوں ان) کی اطاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ ان امور کے پیش نظر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نظامِ قرآنی میں جمہوریت کا نقشہ موجود ہے۔

۳۔ الشوریٰ میں مومنین کے باہمی مشورے "امرھم شوریٰ بینھم" (۴۲ : ۳۸) کے ذریعے مسائل کو زیر بحث لانے اور ان کا تصفیہ کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ البتہ مجلسِ شوریٰ یا مشورہ کرنے والوں کی قطعی ہیئت کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔ اس سے جمہوری طرز کی حکومت کے لئے بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے دائمی اصول کسی صورت نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ ہم موجودہ زمانے کی نمائندہ

اسمبلیوں کو جو مساوی رائے دہندگی کے اصول پر منتخب کی جاتی ہیں اس کی ایک صورت قرار دے سکتے ہیں۔

۴۔ قرآن کی رو سے ہر فرد، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس شے کا مستحق ہے جو اس نے محنت سے کمائی یا ورثے میں پائی ہو۔ اس طرح اسے ملکیت پر قابض رہنے یا اسے فروخت کرنے کے بنیادی حق کی ضمانت مل جاتی ہے بشرطیکہ وہ قانونِ وراثت کے اصولوں اور ان احکامات کی پابندی کرے جو اسکی آمدنی کا ایک حصّہ زکوٰۃ یا خیرات کی صورت میں ادا کرنے کے بارے میں جاری کئے گئے ہیں۔

۵۔ ایک اسلامی مملکت میں کسی بھی مذہب یا عقیدے کے اختیار کرنے کی کامل آزادی ہونی چاہئے۔ لا اکراہ فی الدین (مذہب میں کسی جبر کو دخل نہیں ہے) کو اس سلسلے میں بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن میں تمام انبیاء کا ایک سا احترام کرنے کی تلقین کی گئی ہے خواہ ان کا نام لیا گیا ہے یا نہیں۔ ایک اسلامی مملکت میں تمام اقلیتوں کی ثقافت کا پورا پورا تحفظ کیا جائے گا۔ کوئی شخص صرف اسی صورت میں اسلام قبول کر سکتا ہے جب وہ بلا جبر و اکراہ اپنی رضا سے اسلامی تصوّرِ حیات کو تسلیم کرے۔ جب تک قانون شکنی کا امکان پیدا نہ ہو زندگی اور آزادی محفوظ رہے گی۔

۶۔ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے پر حقوق حاصل ہیں۔ ایک مکتب خیال کے لوگ عورتوں کو عملی سیاست میں حصّہ لینے یا نمائندہ اسمبلی کے انتخابات میں اپنے آپ کو بطور نمائندہ پیش کرنے کا حق دینے سے منکر ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس آیت کا سہارا لیتے ہیں:

الرجال قوامون علی النساء۔ مرد عورتوں کے محافظ یا کفیل ہیں۔

میرا خیال ہے کہ قرآن نے جو نظام حیات پیش کیا ہے اس کے پیش نظر اس آیت کا یہ مطلب نکالنا شاید جائز نہیں ہوگا یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس مکتبِ فکر کے قائد نے خود یہ تجویز پیش کی ہے کہ عورتوں کی ایک علیحدہ اسمبلی ہونی چاہئے تاکہ ان کے مخصوص مسائل کے بارے میں ان کی رائے معلوم کر کے اسے مردوں کی اسمبلی میں زیرِ غور لایا جا سکے۔ اس سے یقیناً عورتوں کو بالواسطہ طور پر اس امر کی اجازت مل جاتی ہے کہ وہ اپنی آواز اس نمائندہ اسمبلی تک پہنچا سکیں جسکو مناسب قوانین بنانے کا حق حاصل ہے۔ ہمیں قرآنِ حکیم کے الفاظ ولھن مثل الذی علیھن۔ اور انہیں مردوں کے مقابلے میں ویسے حقوق حاصل ہیں جیسے مردوں کو ان کے مقابلے میں، یاد رکھنے چاہئیں۔

۷۔ اسلامی دستور کا ایک اصول عدلیہ کی آزادی بھی ہونا چاہئے۔ جہاں تک حدود (جرائم کبیرہ کی سزا) کا تعلق ہے اسلامی مملکت میں کوئی فرد، خواہ وہ اس کا منتخب کردہ صدر ہی کیوں نہ ہو، قانون سے ماوراء نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے بتکرار اس امر پر زور دیا ہے کہ انصاف ہر قسم کی جانبداری سے بلند ہونا چاہئے۔ خواہ فیصلے کی زد منصف کے

اپنے عزیز یا اس کی اپنی جماعت پر پڑتی ہو۔

۸۔ اسلامی مملکت کو موجودہ زمانے کی رفاہی حکومت کے وہ اصول اپنا لینے چاہئیں جن کی رُو سے کمزوروں اور اپاہجوں کی ذمہ داری مملکت پر عائد ہوتی ہے۔ مملکت کے باشندوں کی اخلاقی اور مادی بہبود کا خیال اس کا فرضِ اوّلین ہونا چاہئے۔

۹۔ گھریلو زندگی کی سالمیت اور اس کی پردہ داری کا احترام لازم ہے کسی گھر میں تب ہی داخل ہونا چاہئے جب اس کا مالک اس کی اجازت دیدے اور اس وقت جانا چاہئے جو اس کے لئے موزوں ہو۔

۱۰۔ جہاں تک بین الاقوامی معاملات کا تعلق ہے اسلامی مملکت میں ان تمام اقرارناموں اور معاہدوں کی بڑی سختی سے پابندی کی جائے گی جو برضا و رغبت کئے گئے ہوں اور ایسا کبھی نہ ہوگا کہ فضول بہانوں کی آڑ لے کر محض کاغذ کے ٹکڑے سمجھ کر ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ایک حقیقی اسلامی نظامِ سیاست کی روح ایسے طریق ہائے کار کی کبھی حمایت نہیں کر سکتی جنہیں اختیار کرنے سے دولت یا جائداد صرف معدودے چند افراد کے ہاتھ میں آجائے۔ قرآن کے قوانینِ وراثت، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور سود خوری نیز زکوٰۃ و خیرات کے بارے میں احکامات، جن کا فکری اور عملی حیثیت سے احترام ہر نیک مسلمان پر واجب ہے، اسی مقصد کی تکمیل کے لئے دیئے گئے ہیں۔ اجتماعی مفاد اور استحکام کی خاطر قانون سازی کے لئے چند حدود عائد کی گئی ہیں۔ تاکہ اسلامی مملکت میں دو انتہاؤں کے مابین ایک درمیانی راستہ اختیار کیا جائے خواہ یہ تاراج اور یک جماعتی استبداد کے مابین ہو یا کامل سرمایہ داری اور اشتراکیت یا فسطائیت کے درمیان تاکہ ان طبقاتی جنگوں کا سدِّ باب ہو جائے جو جدلیاتی مادیت کے بقول ناگزیر اور ہمارے مقدر میں لکھی جا چکی ہیں۔

میں نے اس مختصر مقالے کو قرآن کی ان آیات سے تفصیلی بحث کر کے گرانبار بنانے کی کوشش نہیں کی جو مندرجہ بالا نظریات کی تائید میں کثرت سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اوقات یہ تنقید سننے میں آتی ہے کہ ایک اسلامی مملکت کا وجود محض عصرِ نو کے مسلمانوں کے ذہنی تصورات ہی میں ملتا ہے اور تاریخ اس کی مادی تشکیل کی کوئی شہادت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ میری رائے میں خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا عہد بشرطیکہ ہم اس دَور کے حالات کو پیشِ نظر رکھیں، اس قسم کی مثالی مملکت کی بڑی حد تک صحیح مثال پیش کرتا ہے۔ لیکن اس سے میری یہ مراد ہرگز نہیں کہ ہم اپنے دَور کے پیچیدہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس زمانے کا نسبتاً سادہ اور غیر ترقی یافتہ نظام بالکل کورانہ طریق سے من و عن قبول کر لیں۔ بلکہ قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اور ماضی میں ان اصولوں کو عملی سانچے میں ڈھالنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کی تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے ہر اسلامی معاشرے کو اپنے مزاج اور معاشرتی حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنے مسائل کا علیحدہ علیحدہ حل تلاش کرنا ہوگا۔